Oriental College Magazine, Vol.102, No. 02, Serial No. 384, 2026

کلاسیکی اردو شعر کی نامیاتی کائنات

محمد ارسلان (راٹھور)، پی ایچ ڈی
اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

The Organic Universe of Classical Urdu Poetry

Muhammad Arsalan, PhD
Assistant Professor of Urdu
Govt. College University, Lahore

Abstract

Classical Urdu poetry presents the universe not as a mechanical arrangement of isolated objects, but as an organic and interconnected cosmos in which human emotion, nature, spirituality, and metaphysical reality continuously interact. This study explores how major traditional poets of Urdu poetry: Meer, Mushafee, Ghalib, Anees and Nazeer construct a living universe through symbolic imagery, mystical imagination, and aesthetic harmony. The paper examines how elements like the flora and fauna of subcontinent function as dynamic symbols within an integrated poetic ecology.

Keywords:
Classical poetry, metaphor, inklings, organic universe, flora, fauna, insects, aesthetics, world-view

کہا جاتا ہے کہ جب عالمی شہرت یافتہ شاعر پابلو نیرودا نے ۱۹۴۵ میں اپنی طویل اور تہذیبی اثرات کی حامل عظیم نظم (۱): "ماچو پیچو کی بلندیاں" (جس کا اردو ترجمہ جناب ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے کیا ہے) (۲) لکھ لی اور اس کے ثمرے میں نوبل انعام کے مستحق بھی ٹھہرا تو اس کے لیے اگلی چنوتی اپنے آئندہ شعر کی منزل کا تعین تھا یعنی: رومانوی شعر کی معراج سے (ابتدائی شاعری) لے کر ایک دیدہ و زندہ شہر کی نادیدہ و مرموز کیفیت کی وسعتوں کو (ماچو پیچو کی بلندیاں) پا لینے کے بعد اب کون سا عرصہ ہو سکتا تھا جہاں چوب شعر گاڑی جائی؟

حیرت کا مقام ہے کہ نیرودا کی مہم جو شخصیت نے اپنی فکر کا اگلا پڑاؤ اپنے آس پاس کی نہایت چھوٹی، معمولی لیکن بھری پری کائنات پر ڈالا، جیسے کیڑے مکوڑے، پھل، سبزیاں۔

ایک نظم ملاحظہ ہو، جس کا عنوان Ode to the Onion ہے:

> You make us cry without hurting us. I have praised everything that exists, but to me, onion, you are more beautiful than a bird. (3)

آپ کہیں گے کہ اس میں کیا بڑائی ہوئی، یہ طرح تو قریب دو صدیاں پہلے ہمارے ہاں نظیر اکبر آبادی نے بھی ڈالی اور رنگ بھی چوکھا آیا۔ انگریزوں کو تو نظیر کی ادا ایسی بھائی کہ فیلن صاحب نے نظیر کو ہندوستانی شیکسپیئر کہہ ڈالا (۴) (مرزا حامد بیگ نے نظیر اور فیلن پر لمبا چوڑا مقالہ بھی لکھ رکھا ہے)۔ (۵)

ظاہر ہے کہ یہ بات اکہری سطح پر تو درست ہو سکتی ہے، معنوی طور پر صائب نہیں۔ نا ہی شیکسپیئر کی عظمت محض لفظوں کی ریل پیل میں پوشیدہ ہے اور نہ نظیر کا دماغ ان کے لفظی ذخیرے کا رہین۔ یہ بات دونوں کی عظمت یا امتیاز کا ایک پہلو تو ہو سکتی ہے، خود عظمت کا میزان نہیں۔ اصل کارنامہ تو لفظ کو معنی کی نامیاتی فضا کے ساتھ کیمیا بنانے کا ہے۔ جس میں نظیر شیکسپیئر کے ہم پلہ کیا، مصحفی کی معنی آفرینی کے بھی کم ہی قریب پہنچتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب نظیر روٹی کے بارے میں کہتے ہیں:

جس جا پہ ہانڈی چولہا توا اور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے
جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں(۶)

یہ روٹی کا وہ تصور ہے جو سوادِ اعظم کے دل میں تو ہے لیکن وہ لبوں پر لانے کی فن کارانہ استعداد نہیں رکھتے۔ نظیر کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے پہلی بار عام لوگوں کے غیر شعری اور روزمرہ تصورات کو شعر کے کینڈے میں بیان کرنے کی جرات کی، ظاہر ہے یہ اپنے تیئں اشرافیائی معاشرے اور اس کے نفیس تصور لسان پر ایسی کاری ضرب تھی، جس کی شدت آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ نظیر کے ہاں اس نوع کی مثالیں لاتعداد ہیں۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد اس سوال کی طرف واپس آتے ہیں کہ ہمارے شاعروں کو کبھی (بغیر خاص و عام کے امتیاز کے) آس پاس کی کائنات کے زندہ و جاوید پہلوؤں کو دیکھنے کا شوق کیوں نہ چرایا۔ کلاسیکی شاعروں پر مضمون کی یکسانیت اور فارسی ماحول کے چربے کی لاکھ تہمت لگالیں، لیکن ان کے کلام میں آس پاس کی کار آمدہ (In use) چیزوں کی بڑی رنگین اور متنوع فہرست ملتی ہے۔

کلاسیکی شاعروں میں میر و غالب حتیٰ کہ مصحفی تک سبھی نے آس پاس کی نامیاتی کائنات کو اپنے شعر کا موضوع بنایا۔ اس مضمون میں خاص طور پر میں ہندوستانی نباتیہ و حیوانیہ (Flora and Fauna) اور ان کے کنایوں پر بات کرنا چاہتا ہوں۔

ہمارے ہاں یہ غلط فہمی بہت عام ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اردو شعرا نے اپنے ہندوستانی ماحول کو استعارے کی سطح پر پس پشت ڈال دیا اور مستعار ایرانی کائنات کو اپنے کلام میں رواں دواں کیا، ظاہری بات ہے اس لین دین بل کہ صرف لین سے تاثیر کیا خاک پیدا ہوتی, رسمیاتی زندگی کے انجماد میں اضافی ہوتا گیا۔ اس نقطہ ء نظر سے رجوع اور اس کی تصحیح کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارے شعری اجداد لکیر کے فقیر ہی سہی مگر ایسے بھی غبی نہ تھے کہ مستعار لینے کی تخلیقی جہت سے نا آشنا ہوتے۔ الف لیلہ میں صفحوں کے صفحے اور داستان امیر حمزہ میں دفتروں کے دفتر اضافہ کرنے والے دماغ کیا ایسے ابلہ تھے کہ ایرانی شنیدہ کائنات میں ہندوستانی دیدہ کائنات کا چھینٹا بھی نہ پڑنے دیتے؟ گل مہتاب، نسترن و نسرین کے ساتھ ساتھ موتیے، چنبیلی، مولسری، چمپا کی خوشبو نے بھی برابر اپنا جادو جمائے رکھا۔ صندل، شمشاد اور سرو کے پہلو بہ پہلو، کیکر، تلسی اور ناگ پھنی نے بھی اپنا سر اٹھائے رکھا۔ بے ساختہ میر کے کلام سے دو مثالیں یاد آ گئیں، ایک غزل کے قطعہ بند شعروں میں مے خانے کی ویرانی کے ضمن میں جمشید کی گمنامی دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

جز لالہ اس کے جام سے پاتے نہیں نشاں
ہے کوکنار اس کی جگہ اب سبو بدوش(۷)

دیکھ لیجے، لالے کے مقابل میر خالص ہندوستانی پوست کے ڈوڈے کو لے کر آئے ہیں، یہ ہماری ماحولیات نہیں تو اور کیا ہے۔

جنوبی ہند میں آج تک کیلے کے تازہ پتوں پر بھوجن کا رواج ہے۔ (۸) شیرینی اور حلوہ بھی اسی پر کھایا جاتا ہے۔ بہت دن نہیں گزرے کہ پرانے حکیم اور وید اپنی دواؤں کو بھی اسی پر باندھتے تھے۔ اس سے دواؤں کی کیمیائی حالت بھی بہتر رہتی تھی۔ ایسی پڑیا کو اصطلاح میں دونا کہتے ہیں۔ (۹) میرے علم کے مطابق میر نے کم سے کم دو جگہ اس لفظ کا رعایت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ لغت سے بے رغبتی کے باعث اکثر لوگوں نے میر کے شعروں میں دونا کو، دگنا ہی تک محدود کر دیا ہے:

طبیب سبک عقل ہرگز نہ سمجھا
ہوا درد عشق آہ دونا دوا سے (۱۰)
میں جو نرمی کی تو دونا سر چڑھا وہ بدمعاش
کھانے ہی کو دوڑتا ہے اب مجھے حلوا سمجھ (۱۱)

میر ہمارے واحد شاعر ہیں، جن کو یہ احساس ہر دو سطح پر تھا، یعنی وہ قابل محسوس یا Tangible اشیاء کے شعری صرف (Poetic Use) میں دل چسپی لینے کے ساتھ ساتھ ان اشیا کو قائم بالذات اصناف کے طور پر بھی برتنا چاہتے تھے۔ اسے سادہ سی فلسفیانہ اصطلاحات میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ میر کے ہاں، نباتیہ و حیوانیہ کی کار فرمائی، عرض و جوہر دونوں تناظرات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ میر نے اپنی غزل میں تو اس زندہ دنیا کی حرکیات کو دکھایا ہی ہے، لیکن ان کی ھل من مزید کی حامل شخصیت اس پر سیر نہ ہوئی اور انھوں نے شکار نامے، اجگر نامے، موہنی بلی، کتوں پر قطعات، اور خدا جانے کن کن معمولی اور بہ ظاہر قابل نفرین چیزوں پر لکھ ڈالا۔ ذرا سوچیے میر کا کارنامہ کیسا وقیع ہے جب کہ، غالب کے دور میں بھی اردو شاعروں کی تہذیب (Sophistication) انھیں ایسا کرنے سے باز رکھتی تھی۔ میر کا رویہ اس سلسلے میں:

إِنَّ اللَّهَ لاَ يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلاً مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا کا حامل تھا۔ (۱۲) اثر آفرینی اور عبرت گیری کی یہ عمدہ آموزش ہے۔

شمس الرحمن فاروقی کا مضمون "میر صاحب کا زندہ عجائب گھر، کچھ تعجب نہیں خدائی ہے" اس دعوے کو نہایت مستند و مسکت طور سے بیان کرتا ہے۔ (۱۳) میں نے کوشش کر کے کوئی ایسی مثال پیش نہیں کی جو فاروقی صاحب کے مضمون میں پہلے سے آ چکی ہو۔ میر کی غزلوں سے کچھ نئی مثالیں دیکھیے:

کچھ کم ہے ہولناکی صحرائے عاشقی کی
شیروں کو اس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرہ(۱۴)

قشعریرہ جیسا بدیع لفظ اس شعر کی جان ہے، جس میں شیر پر بخار میں طاری ہونے والی سردی اور نقاہت کی کیفیت کا مفہوم شامل ہے۔ اس بظاہر بھاری بھر کم لفظ کو شعر کا لاینفک جزو بنا کر میر نے معنی تو بر آمد کیا ہی ہے، خود غزل کی ساخت کو بھی وسعت آشنا کیا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر کچھ اور شعر دیکھیے:

ناسازی و خشونت جنگل ہی چاہتی ہے
شہروں میں ہم نہ دیکھا بالیدہ ہوتے کیکر(۱۵)

عجب دن میرؔ تھے دیوانگی میں دشت گردی کے
سر اوپر سایہ گستر ہوتے تھے کیکر جہاں میں تھا(۱۶)

شیخ ان لبوں کے بوسے کو اس ریش سے نہ جھک
رکھتا ہے کون آتش سو زندہ گھاس پاس (۱۷)

داڑھی سفید شیخ کی تو مت نظر میں کر
بگلا شکار ہووے تو لگتے ہیں ہاتھ پر (۱۸)

میر کے ہاں یہ شعر معمول کے ہیں۔ انھیں روزمرہ زندگی سے اتنی دل چسپی ہے کہ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ ان چیزوں کا استعمال کرتے ہیں۔

مثنویات اور شکار نامے تو ایسی مثالوں سے بھرے ہیں، صرف نسنگ نامہ ہی کے شعر دیکھیے، جس میں انھوں نے کتوں کی آڑ میں خدا جانے دلی اور اس کے نام نہاد انہدام پذیر اشرافیہ کو کیسے کیسے لتاڑا ہے:

کتوں کے چاروں اور رستے تھے
کتے ہی واں کہے تو بستے تھے
دو کہیں ہیں کھڑے کہیں بیٹھے
چار لوگوں کے گھر میں ہیں پیٹھے
ایک نے پھوڑے باسن ایکو نے
کھود مارے گھروں کے سب کونے

کوئی گھورا کرے کوئی بھونکے
خفتہ خفتہ بھی شور سے چونکے
سانجھ ہوتے قیامت آئی ایک
شور عف عف سے آفت آئی ایک
گلہ گلہ گھروں میں پھرنے لگے
روٹی ٹکڑے کی بو پہ گرنے لگے
ایک نے آکے دیگچہ چاٹا
ایک آیا سو کھا گیا آٹا
ایک نے دوڑ کر دیا پھوڑا
پھر پیا آکے تیل اگر چھوڑا
گھور نے اک لگا اندھیرا کر
ایک نے اور ایک پھیرا کر
گھر میں چھینکے اگر تھے توڑ دیے
ہانڈی باسن گرا کے پھوڑ دیے
لوگ سوتے ہیں کتے پھرتے ہیں
لڑتے ہیں دوڑتے ہیں گرتے ہیں
جب کہ ہڈی پہ چار چار لڑیں
گوشت پر بھیڑیے سے دوڑ پڑیں
ایک کے پیچھے ایک روز و شب
لینڈھے سے واں نہ بندھ رہے تھے کب
کتے ہی واں دو چار رہتے ہیں
دو گئے بھی تو چار رہتے ہیں
جاگتے ہو تو دو بدو کتے
سو کر اٹھو تو روبرو کتے (۱۹)

شکار نامہ دوم سے یہ شعر دیکھیں، جس میں درختوں کے جھنڈ کے لیے کیا عمدہ لفظ اگاس استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی کثرت سے اگنے کے ہیں:

یہی جنگل اس جھیل کے آس پاس
درختوں کا انبوہ نے کا آگاس وہ(۲۰)

میر کے ہاں فطری ماحول کو Philosophize کرنے کا وہ رجحان بھی پایا جاتا ہے جو اردو کے کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آیا، اس میں قدیم و جدید کی کوئی تخصیص نہیں۔ ایک باکمال شعر دیکھیے، جس کے بارے میں سہیل احمد خاں نے لکھا ہے کہ یہ شعر ان کے تخیل کو ششدر کر دیتا ہے:

حیرت گل سے آب جو ٹھٹھکا
بہے بہتیرا پر بہا بھی جائے(۲۱)

مصحفی میر ہی کے معاصر تھے۔ یہ سچ ہے کہ معنی کے ساتھ ان کا شغف میر جتنا چونچال نہیں، لیکن لفظ کے وہ بھی بڑے صراف ہیں۔

شمیم حنفی بہت درست نکتے تک پہنچے کہ مصحفی کے کلام میں اگر میر کی نوع کی وسعت نہیں تو کائناتی رنگارنگی کی کمی بھی نہیں۔(۲۲) ان کی پرگو طبیعت نے دلی کے تہذیبی مرقعے نہ سہی، روزمرہ نقشوں کو ضرور مثبت کر لیا ہے۔ نباتیہ و حیوانیہ کے علاوہ مصحفی نے دلی اور کہیں کہیں امروہے کے موجودات کو جس طرح محفوظ کیا ہے، دیکھیے:

اب دیکھو تو قلعی سی ان کی اکھڑ گئی ہے
تھا جن عمارتوں پہ دلی کی کام گچ کا(۲۳)

ہم فقیروں کو تو کیا چاہیے افشاں کاغذ
خط لکھیں اس کو اگر ہو ہوئی بھگوان کاغذ(۲۴)

یہاں بھگوان کاغذ سے مراد اس زمانے کا پہلا اور عام میسر آنے والا ارزاں کاغذ ہے۔ یہ کاغذ کپڑے کی کرنوں کے کٹاؤ سے بنتا تھا۔(۲۵) میر نے بھی اپنے ایک مطلع میں نام لیے بغیر اس کا ذکر کیا ہے:

غم مضموں نہ خاطر میں نہ دل میں درد کیا حاصل
ہوا کاغذ نمط گو رنگ تیرا زرد کیا حاصل(۲۶)

طول کلامی کیے بغیر مصحفی کے ہاں اسی ذیل کا ایک اور دل چسپ شعر دیکھیے:

اب تلک خمیازہ کھینچے ہیں پڑے اس باغ میں
سو گئے تھے ہم بہ زیر سایہ ء انگور ٹک(۲۷)

اس شعر کا انتخاب میں نے خاص طور پر اس روایت کے سبب کیا ہے، جس کے مطابق انگور کی بیل میں سونے سے بدن میں کاہلی اور کسل مندی پیدا ہوتی ہے اور جسم میں خون کم ہوتا ہے۔(۲۸) سایۂ تاک میں بھوت پریت کی موجودگی کا تصور خاصا عام ہے۔ ریاض کا شعر دیکھیں:

سایۂ تاک میں واعظ کو جگہ دی ہم نے
آج شیشے میں اسے دیکھو اتارا کیسا(۲۹)

شیشے میں جن پری یا بھوت کو اتارا جاتا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ مصحفی کی غزلوں میں مقامی حشرات کا ذکر بھی آیا ہے۔ معروف ہے کہ مشہور نفسیات دان کارل گستاؤ ژونگ کیڑوں کو دیکھ کر کہتا تھا کہ مجھے ان سے دور کے رشتہ دار ہونے کا احساس ہوتا ہے۔(۳۰) ظاہر ہے ژونگ کا قول جینیاتی سے زیادہ اس کے Archetype کے تصور کے قریب ہے۔(۳۱) مصحفی کے ہاں فکر کا اتنا عمق تو نہیں لیکن یہی کیا کم ہے کہ اس نے اس رینگتی دنیا کو متحجر کر لیا:

رنگیں نہیں ناخن ترے پاؤں کے حنا سے
پا بوس کو آئی ہے ترے بیر بہٹی(۳۲)

بیر بہوٹی سرخ رنگ کا کیڑا ہے جسے فارسی میں اپنی ہیئت کی بنا پر عروسک کہتے ہیں۔ (۳۳)

زندہ کائنات سے ان کی دل چسپی آخری دور تک قائم رہی۔ ان کی غزلوں کے دیوان ہشتم (جو نامکمل ہے) سے ایک شعر دیکھیے:

زاہد کو تو نہ ماہیء مطلب ہوئی شکار
بگلا یہ سر جھکائے بہت نہر میں رہا (۳۴)

اسی دیوان کی ایک غزل میں کئی شعر حیاتیہ کی زندگی سے سانس لے رہے ہیں:

جو دال چنے کی پہ لکھے پیل کا خاکہ
ناخن پہ نہ کھینچے وہ گراں ڈیل کا خاکہ
دیمک نے جو چاٹے ہیں میرے شیر کے کاغذ
ہر صف محرم کی ہے قندیل کا خاکہ
خط سیہء عارض جاناں نے دکھایا
خورشید کے صفحے پہ ابابیل کا خاکہ

نامرد دل اس کو بھی کلاں باز ہی سمجھا
تصویروں میں ایا جو نظر چیل کا خاکہ
انگشت بھی رکھتا ہے وہ سوزن سی مژہ کا
کھینچے ہیں پر پشہ پہ جو پیل کا خاکہ (۳۵)

مصحفی کی غزلیات تو خیر اپنی ضخامت کے سبب بھاری پتھر ہوئیں، ان کی مختصر مثنویوں کے عنوان ہی دیکھ لیے جائیں تو آس پاس کی زندہ و نامیاتی اشیاء سے ان کے تخلیقی شغف کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کچھ نام دیکھیے:

مثنوی در ہجو کھٹمل، مثنوی اجوائن خراسانی، مثنوی بز، مثنوی بزبان مینڈھا میگوید، مثنوی در صفت طوطی، مثنوی مرغ نامہ

یہ فہرست لمبی ہے۔

تفنن طبع کے لیے پہلی دونوں مثنویوں کو دو چار شعر لکھتا ہوں:

کھٹملوں کی زبس کہ ہے افراط
تلخ ہے ان سے اپنا خواب نشاط
پائچے میں کبھی گھس آتے ہیں
کبھی نیچے میں سر سراتے ہیں
اک خلش ساری رات ازار میں ہے
آنکھیں بند اور ہاتھ ازار میں ہے
ان کے ہاتھوں سے ہے مجھے سے یار
بیٹھنا چارپائی پر دشوار
ان کی بو سے دماغ عاجز ہے
بل کہ دود چراغ عاجز ہے
بیش و کم چلتی وزباں جن کی
چاہیے ہجو ہی کریں ان کی (۳۶)

مثنوی خراسانی اجوائن کے چند شعر دیکھیں:

کیا کروں وصف تیری اجوائن
تو ہے آرام جاں و راحت تن

اشتہا تجھ سے صاف ہوتی ہے
موت سر کو پکڑ کے روتی ہے
تجھ سے فوراً ڈکار آتی ہے
گل جاں پر بہار آتی ہے
منفعت تجھ میں ہے نہفتہ ہزار
ریگ صحرا سے ہو نہ جس کا شمار
باغ جنت میں گر نہ ہووے تو
میں تو ہر گز کروں نہ اودھر رو
کیوں کہ واں کہ جو کھایئے میوے
کون اصلاح ان کی پھر دیوے (۳۷)

مصحفی نے تو خیر ٹھٹھول کی راہ روزمرہ کی زندگی کو شعر کا حصہ بنایا۔ ہماری حالت یہ ہے کہ جان صاحب اور رنگین کی ریختی آج صرف تہذیبی (کچھ کے نزدیک بے تہذیبی) حالت کی شے ہو کر رہ گئی ہے۔ انھیں پڑھیں تو صاف ان میں روزمرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی کیفیتوں کا مفصل حالت ملتا ہے:

انشا:

اوئی ممانی جان نگوڑا دھڑکا دل میں بیٹھ گیا
آغا جیسا سارا موٹا ماموں بل میں بیٹھ گیا (۳۸)

یہاں آغا سے مراد آغا مینا ہے۔

جان صاحب:

تم اس چمن میں مجھے پھول جانو اجرک کا
اجی خزاں کے نہ میں ہوں بہار کے قابل (۳۹)

ایسے شعری وراثت سے مملو شاعروں نے خدا جانے کیوں جیتی جاگتی دنیا سے منہ بسور لیا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ارد گرد سیکڑوں کی تعداد میں ایسے درخت پھول پودے، کیڑے مکوڑے جانور پرندے اور درندے موجود ہیں جو ہمارے پیچیدہ و مرکب جذبات کی کفایت و کفالت کر سکتے ہیں۔

معروف افسانہ نگار اور شاعر بورخیس کے آخری چھتیس سال بے بصری کی حالت میں گزرے، اس کے نقادوں نے لکھا ہے کہ نابینائی کے اس لمبے دور میں اس نے اپنی نظموں میں رنگوں اور قابل لمس دنیا

کو جس طرح بیان کیا ہے وہ حیران کن سے زیادہ عبرت انگیز ہے۔(۴۰) ایک طرف آنکھوں سے محرومی والوں کا یہ عالم ہے، دوسری طرف ہماری غفلت دیکھیے۔ شہزاد احمد کا شعر یاد آتا ہے:

آنکھ اٹھا کے میری سمت اہل نظر نہ دیکھ پائے
آنکھ نہ ہو تو کس قدر سہل ہے دیکھنا مجھے (۴۱)

مصحفی سے آگے بڑھیں تو غالب آتا ہے۔ غالب کے ماورائی تخیل کو ارزاں زندگی سے زیادہ لگاؤ نہ سہی، لیکن یہاں تک تو انھوں نے بھی کہا:

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے(۴۲)

یہ نہایت سادہ سا شعر شاید فطرت کی طرف کیا، کیوں کیسے کی اس تثلیث کا نقطہ ء آغاز ہے جہاں سے منطقی تفتیش کا آغاز ہوتا ہے۔

غالب نے اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر جہاں جہاں آموں کی محبت میں شعر نظم کیے ہیں، وہاں ان کا روزمرہ دنیا سے ربط ضبط کھل کر سامنے آتا ہے:

بارے، آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میدان ہے
ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں
آئے، یہ گوئے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو، تمھیں خبر کیا ہے!
آم کے آگے نیشکر کیا ہے!(۴۳)

غالب کی نصف سے زیادہ تخلیقی شخصیت کا اظہار ان کے ناول نما خطوں میں ہوتا ہے۔ علائی کے نام منظوم خط کا مزہ لیجے:

خوشی تو ہے آنے کی برسات کے
پییں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم
کہ دِلّی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں
سِوا اناج کے جو ہے مطلوبِ جاں
نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو، کہ ہاں
ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹّے کہاں پائیں اِملی کے پھول
وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشہ دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اُٹھائیں (۴۴)

غالب کے آموں سے اکبر بھی یاد ائے، اکبر کی اپنے دوست منشی نثار حسین کے نام نظم، آم نامہ بھی دیکھتے چلیے:

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجئے
اس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے
ایسا ضرور ہو کہ انہیں رکھ کے کھا سکوں
پختہ اگرچہ بیس تو دس خام بھیجئے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس
سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجئے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہو گی پہلے مگر دام بھیجئے (۴۵)

غالب اور اکبر کی یہ مثالیں بادی النظر میں مزاح کا شاہ کار معلوم ہوتی ہیں، جس سے یقیناً اختلاف نہیں لیکن بات یہ ہے کہ مذاق انھی چیزوں سے ہو سکتا ہے جس کو آپ کے مزاج نے کثرت تجربہ سے مسلمہ بنالیا ہو۔

غالب ہی کے عہد میں میر انیس کے مرثیے نے شہرت کی بلندی دیکھی۔ انیس کا مرثیہ زندہ و جاوید کائنات سے کتنا بھرا ہے، اس کی مثال پیش کرنے سے پہلے دولھا صاحب عروج کے سلسلے میں یہ روایت ذہن میں رہے (جسے نیر مسعود نے "انیس" میں وثوق سے نقل کیا ہے) جس کے مطابق طفلی کے عالم میں میر انیس نے مونس کو پہلو پر بٹھا کر ان سے بچگانہ انداز میں پوچھا: "مرثیہ کہو گے، مرثیہ کہو گے" جب بچے نے سر ہلا کر جواب دیا، تو انیس نے گھر کی افراد کو متوجہ کرکے کہا، اسے پرندوں کی بولی، عورتوں کی زبان اور ریاضی سکھاؤ۔(۴۶) اس روایت کو سامنے رکھ کر مرثیہ گو کی تحصیل کے اصول وضع کیے جاسکتے ہیں، اگرچہ یہ شدید سخت اور راہبانہ ہوں گے۔ میدان کربلا میں رسمیاتی پرندوں اور جانوروں کا ذکر چھوڑ دیں تب بھی انیس کی زنبیل مقامی جواہر سے بھری ہے۔

انیس نے مرثیے کے پردے میں جن گھوڑوں کے نام، اقسام، چال اور لوازمات استعمال کیے ہیں۔ ان پر باقاعدہ کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ انیس کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی اور ضمنی چیزوں کو قائم بالذات بنادیتے ہیں۔ ان کے اس رویے پر انتظار حسین کا بے حد مختصر لیکن موثر مضمون "انیس کے مرثیوں کے شہر" خاصے کی چیز ہے۔(۴۷) شعری مثالوں کی تفصیل میں جائے بغیر اگر الل ٹپ طور پر اقسام اکھٹی کی جائیں تو کچھ یوں فہرست بنے گی:

گھوڑوں کے نام:

دلدل، رخش، براق، سمند، رفرف، شبدیز، توسن، ابلق، رہوار، نرد، چندو، شہباز، اسپ، صبادم، باؤ کا گھوڑا اور خدا جانے کیا کیا۔

اسی حساب سے گھوڑے کے لوازمات دیکھیے:

لگام، لجام، عنان، گردپوش، پیش وپس، رکاب، ٹاپ، سم، شکاربند، چنور، کفل، قربوس، دمچی وغیرہ

میں نے جناب خورشید رضوی سے انیس کے مرثیے کا یہ شعر بہت سنا ہے جس میں گھوڑے کی چال کی مناسبت سے انیس نے ہر لفظ کا برملا استعمال کیا ہے۔ اس شعر سے امراءالقیس، لبید اور اعشیٰ کے شعر کے یاد آتے گے۔ عربی قصیدے میں گھوڑے کی تعریف گویا نامیاتی حصہ ہو کر رہ گئی ہے۔ شعر ہے:

سمٹا جما اڑا ادھر آیا ادھر گیا ۔۔۔ چمکا پھر اجمال دکھایا ٹھہر گیا (۴۸)

یہ شعر ذوالضلیل (حندج، امراء القیس) کے معلقے کے شعر کا ہو بہو عکس معلوم ہوتا ہے:

مِکَـرٍّ مِفَـرٍّ مُقْبِلٍ مُدْبِـرٍ مَعـاً ۔۔۔ کَجُلْمُودِ صَخْرٍ حَطّہُ السَّیْلُ مِنْ عَرِ (۴۹)

(بیک وقت بڑا حملہ آور، تیزی سے پیچھے ہٹنے والا، آگے بڑھنے والا، پشت پھیرنے والا ہے اس پتھر کی طرح جس کو سیلاب (کے بہاو) نے اوپر سے گرایا ہو۔)

اس شعر کے علاوہ کلام انیس میں گھوڑے کی چال پر کئی اور مثالیں دیکھیے:

باگ موڑنا، باگ کسنا، باگ چھوڑنا، باگ اتارنا، باگ کسنا، باگ اتار کے چڑھنا، باگیں اٹھائے رکھنا، ران باگ لینا، بن بن کے پاؤں رکھنا، بادپائی، کنوتیاں چلانا، چراغ پا ہونا، حیوا حیوا کے چلنا۔

انیس گھوڑے کی نفسیات سے اس حد تک آگاہ تھے کہ کہیں کہیں ان کے شعر کا پورا مصرع خود گھوڑے کی چال کے آہنگ پر معلوم ہوتا ہے، ملاحظہ ہو ایک جگہ جناب عباس کی توصیف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خوش خو تھا خانہ زاد تھا دلدل نژاد تھا
عباس بھی سخی تھے فرس بھی جواد تھا (۵)

اس بے مثال شعر میں جواد اپنے تینوں مفاہیم میں کفایت کر رہا ہے، جس میں سے ایک اہم مفہوم اعلیٰ نسل کے گھوڑے کا ہے۔ انیس کی تربیت میں عربی ادب کا چوں کہ بہت بڑا ہاتھ تھا، لہٰذا ان کے کلام میں نیل گائیں، صبح کے خوش الحان پرندے، صحرائی سانپ، مار سیاہ کے انداز و اطوار، شاہ موش اور بہت کچھ اور بھی اس ذیل میں مل جاتا ہے۔

کیا یہ ساری نکتے محض شنیدہ ہو سکتے ہیں؟

انیس ہی کے دور میں نظیر نے تو گویا آنے والوں کے لیے لفظیات کی سطح پر اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا، یہ الگ بات ہے کہ نظیر کے ہاں حیوانی و نباتی زندگی تصویری سطح پر رہتی ہے اور تخلیقی عکس بننے نہیں پاتی۔ اسے آپ Photograph اور Painting کا فرق کہہ لیجیے۔ لیکن زبان کے ابتدائی مراحل میں متنوع اسالیب مہیا کر دینا کیا کم ہے۔ ان کی نظموں کے عنوانات ہی میں آدھا فلورا فانا در آتا ہے۔ بلبلوں کی لڑائی (ملاحظہ ہو کہ یہ عنوان ہمارے شاعرانہ تخیل کر کیسا گراں گزرتا ہے)، گلہری کا بچہ، ریچھ کا بچہ، اژدہے کا بچہ، خربوزہ، نارنگی، سنگترا، آگرے کی ککڑی، تربوز، مکھیاں یہ سب ان کی شعری کائنات میں در آیا ہے۔ آگرہ سے ان کی محبت کوئی ڈھکی چھپی نہیں، میں خاص طور پر آگرے کی ککڑی کے شعر پڑھتا ہوں، یہ عنوان و موضوع ہر دو سطح پر ان کے شعر کا خالص Native اظہار ہیں، دیکھیے:

پہنچے نہ اس کو ہر گز کابل درے کی ککڑی
نے پورب اور نہ پچھّم خوبی بھرے کی ککڑی
نے چین کے پرے کی اور نہ ورے کی ککڑی
نے دکھّن اور نہ ہر گز اُس سے پرے کی ککڑی
کیا خوب نرم و نازک اِس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی
بیل اس کی ایسی نازک، جوں زلف پیچ کھائی
بیج ایسے چھوٹے چھوٹے خشخاش یا کہ رائی
دیکھ اس کی ایسی نرمی، باریکی اور گُلائی
آتی ہے یاد ہم کو محبوب کی کلائی
کیا خوب نرم و نازک اِس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی (۵۱)

دل چسپی کی بات ہے کہ اس بند میں نظیر نے خربوزے کی مختلف اقسام گنوا کر ان کا تقابل بھی کر دیا ہے۔ ایسا نہیں کہ نظیر داخلی جذبات کے اظہار میں بالکل ہی کورے ہیں، وہ اس ساری رنگارنگی میں وہ کہیں کہیں استعارہ سازی میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں، مثلاً تربوز پر لکھتے ہوئے جب وہ محبوب کی گلی میں کھیت ہو جانے والوں کا ذکر کرتے ہیں تو یہ بیان محض فہرست سازی سے آگے کی شے نظر آتی ہے:

آرزو ہی میں وہ سب مر کے ہوئے خاک سیاہ
ان شہیدوں کی بھی کچھ تجھ کو خبر ہے واللہ (۵۲)

یہاں لہجے کی الم ناکی واضح ہے۔

نظیر کی لفظیات کو سوکھا کہنے والے یاد رکھیں جب حسن عسکری عظیم امریکی ناول موبی ڈک کا ترجمہ کر رہے تھے تو اردو میں جہاز اور جہاز رانی کی اصطلاحات نہ ہونے کے بڑے شاکی تھی اور خود سے جہاز کا اگلا حصہ، جہاز کا پچھلا حصہ جیسے لفظوں سے بات بڑھا رہے تھے۔(۵۳) میر، انیس اور نظیر جیسے شاعروں کی حامل تہذیب میں لفظوں کی ایسی کمی عبرت انگیز ہے۔

میں نے مرحوم مظہر محمود شیرانی سے سنا ہے کہ واجد علی شاہ نے لکھنو میں جانوروں اور پرندوں کے لیے جو رمنے اور باغات بنوائے تھے، اس کے لیے امیر مینائی نے خاص طور پر ایک مثنوی کہی تھی، اس

کے تیرہ سو شعروں میں ہر شعر میں ایک نئے پرندے کے خصائص کو معنی بند کرتا تھا، افسوس کہ یہ مثنوی امیر کے متداول دواوین میں نہیں ملتی، شیرانی صاحب کو اس کے دو تین شعر یاد تھے، جو انھیں غالباً حافظ محمود شیرانی کے مسکوکات کی انگریزی کتاب پر لکھے ملے تھے۔(۵۴) رنج کی بات ہے کہ یہ مثنوی وقت کے ساتھ رفت و گزشت ہو گئی۔ بہ ہر حال نیر مسعود کے افسانے طاؤس چمن کی مینا اور Vipul Varshney کی کتاب Lucknow: A walk through History سے یہ بات افسانہ معلوم نہیں ہوتی۔(۵۵) نیر مسعود نے تو واجد علی شاہ کی پرندوں کے حوالے سے جس جناتی یاداشت کو بیان کیا ہے، اسے ہضم کرنا آسان نہیں۔ (۵۶)

کلاسیکی اردو میں تو رنگوں کے ناموں کی فہرست ایسی لامع ہے کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، ظاہر ہے یہ زبان کے لیے فخر کا مقام ہے۔ رنگ کائنات کی لطافت کے درمیان حد فاصل قائم کرنے کا بڑا باریک اظہار ہیں۔ رنگوں سے دل چسپی خود کائنات سے دلچسپی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، میری نظر سے ہندوستان ٹائمز کا ایک فکر انگیز مضمون گزرا، عنوان تھا(57) Grey matter: Are colours fading from our world :

مضمون میں دنیا میں تشویش ناک حد تک بڑھتی ہوئی یک رنگی کے حوالے سے بتایا گیا۔ شاعری تو خیر خلاقانہ مظہر ہوا، عام زندگی میں برتی جانے والی چیزوں مثلاً لباس، گاڑیوں، گھروں کے روغن، بستر کی چادروں، موبائل کے کوروں اور کتابوں کی جلدوں تک کو خوف ناک حد تک سپاٹ بنایا جا رہا ہے۔ ہم سفید سیاہ اور سلیٹی رنگ کی تثلیث میں گھر کر رہ گئے ہیں۔ زیادہ دور کی بات نہیں کہ لوگوں کو اور نہیں تو بنفشی، آبی، گیروی اور چمپئی رنگوں کا عام علم تھا۔ رنگریزوں کے ہاں بلا مبالغہ سیکڑوں رنگوں کے نمونے ہوتے تھے۔ نہایت دلچسپ بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کے اواخر سے ہماری شاعری میں بھی صرف دو ہی تین طرح کے رنگوں کو استعمال کیا جا رہا ہے، بار بار پلٹ کر۔ شاعری اپنے عہد کی اور بعض صورتوں میں اپنے عہد سے آگے کی ترجمانی کرتی ہے۔ ہماری بے رنگ زندگیوں میں شاعر کی زندگی بھی رنگوں سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ کلاسیکی شاعروں کے متنوع رنگ

ایک پورا قاموس ہیں، جنھیں آنے والی نسلوں کے لیے نصاب کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ موضوع قائم بالذات اور تفصیلی مطالعے کا متقاضی ہے۔ سمجھنے کی بات کہنے یہ ہے، آج دنیا جس ماحول اور ماحولیاتی تنقید و ادب کی طرف رجوع کر رہی ہے، کہیں یہ ہماری منازل گزشتہ و گم گشتہ کا نشان تو نہیں؟

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں (۵۸)

☆☆☆☆☆

حوالے

(1) Neruda, Pablo. The Heights of Macchu Picchu. Translated by Nathaniel Tarn. New York: Farrar, Straus & Giroux, 1966

(۲) کاشمیری، ڈاکٹر تبسم، ماچو پچو کی بلندیاں: تعارف، مشمولہ، ادبیات، بین الاقوامی ادب نمبر ۳، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۷ء)، ۲۷۲

(3) Neruda, Pablo. "Ode to the Onion." In Full Woman, Fleshly Apple, Hot Moon: Selected Poems of Pablo Neruda, translated by Stephen Mitchell,New York: Harper Perennial Modern Classics, 2009,P 51-55

(۴) آسی، عبد الباری، مقدمہ، کلیات نظیر، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، ۱۹۹۷ء)، ۴۳۔

(۵) حامد بیگ، مرزا، فلین اور نظیر مشمولہ غالب نامہ، شمارہ نمبر ۵، (دہلی: غالب انسٹیٹیوٹ، ۱۹۹۸ء)، ۱۷۱۔

(۶) آسی، عبد الباری، مقدمہ، کلیات نظیر، ۲۲۷۔

(۷) میر، میر تقی، کلیات میر، جلد اول، (لاہور: مجلس ترقی ادب، طباعت سوم، ۲۰۱۱ء)، ۲۶۳۔

(8) https://pmc.ncbi.nlm.nih.gov/articles/PMC9122687/

(۹) اردو لغت تاریخی اصول پر، جلد پنجم، (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۸۱ء)، ۳۵۱۔

(۱۰) میر، میر تقی، کلیات میر، جلد اول، ۵۵۲۔

(۱۱) میر، میر تقی، کلیات میر، جلد دوم، (لاہور: مجلس ترقی ادب، طباعت سوم، ۲۰۱۱ء)، ۴۴۶۔

(۱۲) القرآن، سورہ البقرہ، ۲: ۲۶

(۱۳) فاروقی، شمس الرحمٰن، میر صاحب کا زندہ عجائب گھر، کچھ تعجب نہیں خدائی ہے، مشمولہ صورت و معنی سخن (کراچی: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء)، ۱۸۱۔

(۱۴) میر، میر تقی، کلیات میر، جلد دوم، ۴۰۲۔

(۱۵) ایضاً، ۲۲۰۔

(۱۶) میر، میر تقی، کلیات میر، جلد سوم، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء)، ۷۰۔

(۱۷) میر، میر تقی، کلیات میر، جلد دوم، ۱۹۰۔

(۱۸) میر، میر تقی، کلیات میر، جلد اول، ۲۰۱۔

(۱۹) محمد، سید، مثنویات میر، (حیدر آباد: مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۹۲۳ء)، ۱۹۸۔

(۲۰) ایضاً، ۲۰۱۔

(۲۱) سہیل احمد، طرزیں، (لاہور، قوسین، ۱۹۸۲ء)، ۱۱۷۔

(۲۲) حنفی، شمیم، مصحفی کا شعر، دیباچہ، کلیات مصحفی، جلد پنجم، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۱ء)، ۴۵۔

(۲۳) مصحفی، غلام ہمدانی، دیوان اول، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۱ء)، ۳۳۳۔

(۲۴) مصحفی، غلام ہمدانی، دیوان ہفتم، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۴ء)، ۲۵۲ ۔

(۲۵) اردو لغت تاریخی اصول پر، جلد سوم، (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۱ء)، ۸۷۴۔

(۲۶) میر، میر تقی، کلیات میر، جلد چہارم، (لاہور: مجلس ترقی ادب ۲۰۰۶ء)، ۳۱۱۔

(۲۷) مصحفی، غلام ہمدانی، دیوان سوم، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۱ء)، ۴۷۱۔

(۲۸) ایضاً، پاورق، از نور الحسن نقوی۔

(۲۹) خلیل اللہ خان، ڈاکٹر، انتخاب ریاض خیر آبادی، (محمود آباد، راجہ محمود آباد لائبریری، ۱۹۸۲ء)، ۸۱۔

(30) Jung, C. G. Memories, Dreams, Reflections. Edited by Aniela Jaffé. Translated by Richard and Clara Winston. New York: Vintage Books, 1989.

(31) https://www.britannica.com/topic/archetype

(۳۲) مصحفی، غلام ہمدانی، دیوان چہارم، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو)۔

(۳۴) مصحفی، غلام ہمدانی، دیوان ہشتم، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۴ء)، ۳۰۔

(۳۵) ایضاً، ۸۰۔

(۳۶) مصحفی، غلام ہمدانی، دیوان اول، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۱ء)، ۶۷۸۔

(۳۷) ایضاً، ۶۸۱۔

(۳۸) نقوی، سید سبط محمد، انتخاب ریختی، (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء)، ۹۰۔

(۳۹) ایضاً، ۹۲۔

(۴۰) احمد، حسن، بورخیس کی نظمیں: تعارف، مشمولہ، ادبیات، بین الاقوامی ادب نمبر ۳، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۷ء)، ۳۱۱۔

(۴۱) احمد، شہزاد، ٹوٹا ہوا پل، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء)، ۸۷۔

(۴۲) غالب، میرزا اسد اللہ خان، دیوان غالب، (دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۰۱ء)، ۱۷۱۔

(۴۳) ایضاً، ۳۸۹۔

(۴۴) انجم، خلیق، غالب کے خطوط، جلد اول، مرقومہ بنام علاؤ الدین علائی، (دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۷ء)، ۱۸۱۔

(۴۵) زکریا، خواجہ محمد، کلیات اکبر، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۲۲ء)، ۴۵۱۔

(۴۶) مسعود، ڈاکٹر نیّر، دولہا صاحب عروج، (لکھنؤ: اردو پبلی کیشنز ۱۹۸۰ء)، ۵۶

(۴۷) انتظار حسین، انیس کے مرثیوں کے شہر، (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء)، ۱۷۵۔

(۴۸) صفدر علی، انتخاب میر انیس، (لکھنؤ: اردو اکادمی، ۱۹۸۶ء)، ۲۱۳۔

(۴۹) رضوی، ڈاکٹر خورشید، عربی ادب قبل از اسلام، (لاہور: ادارہ اسلامیات، ۲۰۱۷ء)، ۲۲۰۔

(۵۰) صفدر علی، انتخاب میر انیس، (لکھنؤ: اردو اکادمی، ۱۹۸۶ء)، ۱۸۱۔

(۵۱) آسی، عبد الباری، مقدمہ، کلیات نظیر، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، ۱۹۹۷ء)، ۴۱۳۔

(۵۲) ایضاً، ۵۲۳۔

(۵۳) عسکری، حسن، مترجم (ہرمن میلول)، موبی ڈک، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء)، ۱۱۔

(۵۴) بہ حوالہ ذاتی گفتگو

(55) Varshney, Vipul B. Lucknow: The City of Heritage & Culture: A Walk Through History. Nw Delhi: Niyogi Books, 2017.

(۵۶) مسعود، نیر، طاؤس چمن کی مینا، (دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ۱۵۱۔

(57) Viegas, Vanessa. “Grey Matter: Are Colours Fading from Our World?” Hindustan Times. February 11, 2023. Accessed May 25, 2026.

(۵۸) علامہ محمد اقبال، علامہ محمد، کلیات اقبال، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۴ء)، ۴۰۳۔

BIBLOGRAPHY

- Ahmad, Hasan. “Borges ki Nazmein: Ta’aruf.” In Adabiyat: Bain-ul-Aqwami Adab, no. 3. Islamabad: Pakistan Academy of Letters, 1997.
- Ahmad, Shehzad. Toota Hua Pul. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1993.
- Anjum, Khaliq, ed. Ghalib ke Khutoot. Vol. 1. Delhi: Anjuman Taraqqi-e-Urdu (Hind), 1997.
- Asi, Abdul Bari. “Muqaddama.” In Kulliyat-e-Nazeer. Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language, 1997.
- Askari, Hasan, trans. Moby-Dick. By Herman Melville. Lahore: Fiction House, 2002.
- The Holy Qur’an. Surah al-Baqarah (2:26).
- Faruqi, Shamsur Rahman. “Mir Sahib ka Zinda Ajaib Ghar.” In Soorat-o-Ma’ni-e-Sukhan. Karachi: Oxford University Press, 2006.
- Ghalib, Mirza Asadullah Khan. Diwan-e-Ghalib. Delhi: Urdu Academy, 2001.
- Hamid Beg, Mirza. “Flaneur aur Nazeer.” In Ghalib Nama, no. 5. Delhi: Ghalib Institute, 1998.
- Hanfi, Shamim. “Mushafi ka Sher.” Preface to Kulliyat-e-Mushafi. Vol. 5. Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language, 2001.
- Husain, Intizar. Anees ke Marsiyon ke Shehar. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1985.
- Iqbal, Muhammad. Kulliyat-e-Iqbal. Delhi: Educational Publishing House, 2014.
- Jung, C. G. Memories, Dreams, Reflections. Edited by Aniela Jaffé. Translated by Richard and Clara Winston. New York: Vintage Books, 1989.
- Kashmiri, Tabassum. “Machu Picchu ki Bulandiyan: Ta’aruf.” In Adabiyat: Bain-ul-Aqwami Adab, no. 3. Islamabad: Pakistan Academy of Letters, 1997.
- Khalilullah Khan. Intikhab-e-Riyaz Khairabadi. Mahmoodabad: Raja Mahmoodabad Library, 1982.
- Lughat Board. Urdu Lughat: Tarikhi Usool Par. Vol. 3. Karachi: Urdu Lughat Board, 1991.

- Lughat Board. Urdu Lughat: Tarikhi Usool Par. Vol. 5. Karachi: Urdu Lughat Board, 1981.
- Masood, Nayyar. Dulha Sahib Urooj. Lucknow: Urdu Publications, 1980.
- Masood, Nayyar. Taus Chaman ki Maina. Delhi: Arshia Publications, 2013.
- Meer, Mir Taqi. Kulliyat-e-Meer. Vol. 1. Lahore: Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, 2011.
- Meer, Mir Taqi. Kulliyat-e-Meer. Vol. 2. Lahore: Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, 2011.
- Meer, Mir Taqi. Kulliyat-e-Meer. Vol. 3. Lahore: Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, 2009.
- Meer, Mir Taqi. Kulliyat-e-Meer. Vol. 4. Lahore: Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, 2006.
- Muhammad, Syed. Masnaviyat-e-Meer. Hyderabad: Maktaba Ibrahimiyah, 1923.
- Mushafi, Ghulam Hamdani. Diwan-e-Awwal. Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language, 2001.
- Mushafi, Ghulam Hamdani. Diwan-e-Sewum. Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language, 2001.
- Mushafi, Ghulam Hamdani. Diwan-e-Chaharum. Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language, 2001.
- Mushafi, Ghulam Hamdani. Diwan-e-Haftum. Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language, 2004.
- Mushafi, Ghulam Hamdani. Diwan-e-Hashtum. Delhi: National Council for Promotion of Urdu Language, 2004.
- Naqvi, Syed Sibt Muhammad. Intikhab-e-Rekhti. Lucknow: Uttar Pradesh Urdu Academy, 1983.
- Neruda, Pablo. The Heights of Macchu Picchu. Translated by Nathaniel Tarn. New York: Farrar, Straus & Giroux, 1966.
- Neruda, Pablo. “Ode to the Onion.” In Full Woman, Fleshly Apple, Hot Moon: Selected Poems of Pablo Neruda. Translated by Stephen Mitchell. New York: Harper Perennial Modern Classics, 2009.
- Pakistan Academy of Letters. Adabiyat: Bain-ul-Aqwami Adab. No. 3. Islamabad: Pakistan Academy of Letters, 1997.
- Ridvi, Khurshid. Arabi Adab Qabl az Islam. Lahore: Idara-e-Islamiyat, 2017.
- Safdar Ali, ed. Intikhab-e-Mir Anees. Lucknow: Urdu Academy, 1986.
- Sohail Ahmad. Tarzein. Lahore: Qausain, 1982.
- Varshney, Vipul B. Lucknow: The City of Heritage & Culture: A Walk Through History. New Delhi: Niyogi Books, 2017.
- Viegas, Vanessa. “Grey Matter: Are Colours Fading from Our World?” Hindustan Times, February 11, 2023.
- Zakaria, Khwaja Muhammad. Kulliyat-e-Akbar. Lahore: Al-Hamd Publications, 2022.

❖❖❖